# عظیم الشان صدیقی کی شانِ انفرادیت

**ڈاکٹر تابش مہدی**

G5/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025، موبائل: 9818327947

۴؍ جون ۲۰۱۸ کی شام میں پروفیسر عظیم الشان صدیقی (۱۹۳۵ء۔ ۲۰۱۸ء) اِس جہاں سے رخصت ہوگئے۔ یہ خبر مجھے اس وقت ملی، جب میں اپنے ملک سے بہت دور یوکے میں تھا۔ اب بھی وہیں ہوں۔ اِس ناگہانی وجاں کاہ خبر نے مجھے ہلا کے رکھ دیا۔ میں نے اناللہ وانّا والیہ راجعون پڑھا اور بہت دیر تک کتابِ ماضی کی ورق گردانی کرتا رہا۔ یہ خبر کوئی ان ہونی یا غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ کافی دنوں سے بیمار چل رہے تھے۔ عمر بھی خاصی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ غم اِس بات کا تھا کہ میں اپنے مشفق ومحبّ کا آخری دیدار نہ کرسکا اور ان کی تدفین میں شرکت سے محروم رہا۔

اُسی روز لندن میں سید عقیل دانشؔ سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی امروہوی ہیں، دہلی یونی ورسٹی کے مرحوم پروفیسر سیّد شریف احمد کے برادرِ خرد ہیں، انھوں نے کہا کہ انھیں یہ خبر مل چکی تھی۔ وہ ان کے عزیزوں میں تھے۔ انھوں نے برجستہ فرمایا:

حامل فکر و فن تھے وہ دانشؔ
نام ان کا رہا عظیم الشان
وہ جہاں بھی رہے، رہے ممتاز
کام ان کا رہا عظیم الشان

پروفیسر عظیم الشان صدیقی سے مجھے قلبی تعلق تھا۔ میں اُن کے نیاز مندوں میں تھا۔ ان سے تعلق کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ استاذِ محترم علامہ شہبازؔ صدیقی امروہوی کے عزیزوں اور نیاز مندوں میں تھے۔ اپنے ایم۔اے کی تیاری میں اُن سے استفادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہ وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ اس زمانے میں تقریباً ہر ہفتے ان کا امروہے جانا رہتا تھا۔ دونوں میں قربِ مکانی بھی تھا۔ استاذِ محترم محلّہ چاہِ غوری میں رہتے تھے اور وہ محلّہ چاہِ شور سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہی چاہِ شور ہے، جسے امروہے کے عرف عام میں کھارا کنواں کہا جاتا ہے۔ ان سے میری پہلی ملاقات بھی آشیانۂ شہباز کے تہ خانے میں ہوئی تھی۔ وہ جناب مستقیم خاں کے ہم راہ تشریف لائے تھے۔ بھائی غیور حسن اور بعض دوسرے احباب پہلے ہی سے موجود تھے۔ بڑی دل چسپ اور معلومات افزا محفل جمی تھی۔ اس کے بعد دلّی میں اس وقت ان سے ملاقات ہوئی، جب میں ریسرچ اسکالر کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے جڑا۔ پھر اُس کے بعد اُن سے کتنی ملاقاتیں رہیں، یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ اُن کے دلّی کے گلی قاسم جان والے دولت خانے پر بھی میں گیا اور وہ بھی ایک سے زائد بار غریب خانے پر تشریف لائے۔ جس زمانے میں میں اردو اکادمی دہلی سے وابستہ تھا، مسلسل تشریف لاتے رہے۔ ماہ نامہ ایوانِ اردو اور بچوں کا ماہنامہ امنگ کے لیے مجھ سے کافی توقع رکھتے تھے۔ مفید مشوروں سے بھی نوازتے تھے۔ وہ ان دنوں اکادمی کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی تھے۔ اُن سے تعلق و نیاز مندی کی دوسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک اچھے اور عظیم انسان تھے۔ یہ چیز آج کے دور میں مفقود سی ہوتی جارہی ہے۔ خواجۂ حالیؔ بہت پہلے کہہ گئے ہیں:

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

خردنوازی، دردمندی اور ضرورت پہ کسی کے کام آنا، ان کا مزاج تھا۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی ہمارے عہد کے خاموش ادیب و ناقد تھے۔ تنقید وتخلیق دونوں سے اُن کا رشتہ تھا اور دونوں ہی سطحوں پر انھوں نے متاثر کیا ہے۔ وہ افسانہ نگاری کے ذریعے سے وادیِ ادب میں داخل ہوئے تھے۔ فکشن میں اُن کی غیر معمولی خدمات ہیں، لیکن انھوں نے شہرت و نام وری حاصل کرنے کے لیے کوئی حربہ نہیں استعمال کیا۔ بس یک سوئی و خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ وہ ادب میں اُس

نظریے کے حامی تھے، جس میں ادب یا ادیب کو سماج کا مصلح و مربی تسلیم کیا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے اُن کے افسانوں اور تنقیدی مضامین کا مطالعہ کیا ہے، وہ میری رائے کی تصویب کریں گے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی کا یہ بڑا امتیاز ہے کہ انھوں نے اپنی ادب فہمی کو صرف ناول یا افسانے تک محدود رکھا۔ ادب کی دوسری اصناف کو انھوں نے اپنی گفتگو کا موضوع نہیں بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی تنقید سے قاری کو یک گونہ یک سوئی، اطمینان اور تکمیل کا احساس ہوتا ہے۔ وہ انھیں پڑھنے کے بعد یہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے کچھ ملا ہے۔ عظیم الشان صدیقی نے ادب یا تنقید میں جو کچھ لکھا ہے، وہ صاف اور واضح انداز میں لکھا ہے۔ ایسا اُسی وقت ہوتا ہے، جب لکھنے والے پر موضوع واضح اور منقح ہو۔ اگر کوئی غیر شاعر ناقد شاعری پر گفتگو کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا حق نہیں ادا کر سکے گا۔ وہ تو بس معنویت کے فلسفوں میں الجھا رہے گا۔ شاعر نے کیا بات کس انداز سے کہی ہے، اُسے زبان و بیان پر کتنی قدرت ہے اور فنی قدروں کا اسے کس حد تک پاس ولحاظ ہے یا اس کے ہاں شعری روایات کا کس درجہ احترام ملتا ہے، اِس سے اس کا کوئی سروکار نہ ہوگا۔ جب کہ شاعری میں یہی باتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ ہم نے تو بعض ناقدین کے ہاں ناموزوں اور ساقط الوزن اشعار بھی اُن کے پسندیدہ اشعار کی فہرست میں دیکھے ہیں۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی اردو کے ادیب و ناقد بھی تھے اور اردو کے معلم و مربی بھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ وہ اردو کے وفادار عاشق تھے۔ وہ اُن لوگوں میں نہیں تھے، جو کھاتے تو اردو کی ہیں، لیکن اُن کی ساری وفاداریاں انگریزی سے ہوتی ہیں۔ وہ انگریزی ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بچوں کے داخلے انگلش میڈیم اسکولوں میں کراتے ہیں اور اُسی کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنے لیے اور اپنے بچوں کے لیے انگریزی کے مختلف روزنامے، ہفت روزے یا ماہ نامے منگواتے ہیں، لیکن اردو کا ایک اخبار بھی اُن کے گھر پہ نہیں آتا۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی اپنی تحریروں اور نجی گفتگوؤں میں ناول اور افسانوں کی زبان میں علاقائیت کے رجحان پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے تھے کہ اردو لکھنے، پڑھنے اور بولنے والوں کی اکتسابی نہیں مادری زبان ہے۔ اِس لیے اُنھیں حق پہنچتا ہے کہ وہ اُس محاوراتی زبان کو ہی استعمال کریں، جس پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ اُن کی رائے میں ایسی صورت میں اردو زبان کو بھی فائدہ پہنچے گا اور اردو تہذیب کو بھی۔ اِس کثرتِ استعمال سے بہت مضبوط و توانا الفاظ اور محاورے زبان کا جز بن کر اس کے دامن کو وسیع کر سکیں گے۔ وہ یہ بھی رائے رکھتے تھے کہ چوں کہ پریم چند اور نذیر احمد نے اِس راز کو پالیا تھا، اِس لیے اُنھیں کبھی زبان کی تنگ دامنی کا شکوہ نہیں ہوا۔ جب کہ موجودہ عہد کے ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اُن کی رائے میں کرشن چندر کے ہاں مجموعی طور پر شاعری کی زبان ملتی ہے۔ بیدی کتابی زبان کے عادی ہیں، قاضی عبدالستار کے ہاں ادبی زبان کی لَے بڑھی ہوئی ہے، قرۃ العین حیدر فلسفیانہ اسلوب میں انشائیے کی زبان استعمال کرتی تھیں اور عصمت چغتائی کی زبان حد درجہ غیر متنوع ہے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی نجی صحبتوں میں بھی کہتے تھے اور کئی جگہ لکھا بھی ہے کہ وہ کسی ادبی گروہ یا دبستاں سے لاتعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں آج کی وہ لگی بندھی اصطلاحیں نہیں ملتیں، جنھیں ہمارے عہد کے بالعموم ناقدین استعمال کرنا ضروری، بل کہ اپنی شانِ امتیازی تصور کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں اُن کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ جو بات اُن کے علم، تجربے یا مشاہدے میں آتی تھی، اُسے وہ بے کم و کاست سپردِ قلم کر دیتے تھے۔ اس کے لیے کسی بیساکھی کا سہارا نہیں لیتے تھے۔

پروفیسر عظیم الشان صدیقی نے ہمیشہ خردوں کی حوصلہ افزائی اور بزرگوں کی توقیر و تکریم کا مظاہرہ کیا ہے۔ میری کتاب 'اردو تنقید کا سفر' شائع ہوئی تو انھوں نے سب سے پہلے فون کیا اور اردو اکادمی دہلی میں تشریف لاکر مبارک باد دی اور اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ جب بھی میری کوئی کتاب شائع ہوئی اور کسی اخبار میں اس پر تبصرہ دیکھا، فوراً فون کیا اور مبارک باد دی۔ اُنھیں میرے سلسلے میں اِس بات کا بڑا قلق تھا کہ میں کسی دانش گاہ کے شعبۂ اردو کا جزو نہ بن سکا۔ اس کے روشن و تاریک پہلوؤں پر وہ بڑی تفصیلی گفتگو کرتے تھے۔ اسباب بھی بیان کرتے تھے۔ میں نے استاذ محترم علامہ شہباز صدیقی امروہوی کی یاد میں نئے لکھنے والوں کی شعری و ادبی تربیت کے لیے بزمِ شہبازؔ قائم کی تو بہت خوش ہوئے۔ جب بھی اس کی سرگرمیاں اخبارات یا کسی دوسرے ذریعے سے ان تک پہنچتی تھیں، وہ ضرور فون کر کے تحسینی کلمات سے نوازتے تھے۔

ایک بار غالب اکیڈمی کی ایک ملاقات میں عظیم بھائی نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: تابش میاں! آپ جو اِس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ امروہہ لکھنؤ اور دلّی کے درمیان اپنے آپ میں شعر و ادب کا دبستاں ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے آپ کے پاس؟ عرض کیا: عظیم بھائی! دلائل تو بہت ہیں۔ تفصیل میں جانے کے لیے وقت درکار ہے، جو نہ آپ کے پاس ہے اور نہ اِس وقت میرے ہی پاس ہے۔ سرِ دست آپ حضرتِ مصحفی کو لے لیجیے۔ میر تقی میر کے بعد کے جتنے شعری سلسلے ہیں، اُن میں سے تقریباً ہر ایک کا سرا شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی سے ملتا ہے۔ اُن سے دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں کے اساطین نے استفادہ کیا ہے اور انھوں نے مصحفی سے اپنا رشتۂ سخن جوڑنے میں فخر محسوس کیا ہے۔ میرے اِس جواب پر ہلکا سا سکوت فرمایا اور زور دار انداز میں فرمایا: 'مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے۔'

جس زمانے میں میں اپنے تحقیقی مقالے کی تکمیل کر رہا تھا۔ مجھے بعض ایسی کتابوں کی ضرورت پڑی، جو پروفیسر عظیم الشان صدیقی کے پاس موجود تھیں۔ استاذِ محترم پروفیسر عنوان چشتی نے فرمایا: 'یہ کتابیں تمھیں عظیم الشان صدیقی کے گھر جا کر دیکھنی ہوں گی۔ وہ کسی کو کتابیں دینے میں بہت محتاط ہیں۔' اُن دنوں میں مرکزی مکتبہ اسلامی، چتلی قبر، دہلی میں کام کرتا تھا۔ ابوالفضل انکلیو سے روزانہ آمد و رفت رہتی تھی۔ میرے ساتھ امروہے کے ایک بزرگ سید احمد نقوی بھی کام کرتے تھے۔ وطناً وہ بھی امروہوی تھے۔ محلّہ دربارِ کلاں کے رہنے والے تھے۔ ان کی رہائش عظیم الشان صدیقی سے قریب تھی۔ میں نے ایک خط لکھ کر اُن کے ذریعے سے بھیجا۔ اُس میں میں نے لکھا تھا کہ میں بعض مجبوریوں کی وجہ سے آپ کے دولت خانے پر اس کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ اگر آپ دو چار دن کے لیے مرحمت فرما دیں گے تو اِن شاء اللہ اعتماد مجروح نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں مجھے محترم تنویر احمد علوی، مولانا اخلاق حسین قاسمی اور پروفیسر عنوان چشتی جیسے عظیم لوگوں کا اعتماد حاصل ہے۔ میں نے خط میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اِنشاء اللہ کل بعد نماز عصر حاضر ہوں گا، اِس ارادے کے ساتھ کہ اگر آپ نے کتابیں گھر لانے کی اجازت نہ دی تو وہیں اسی وقت مطالعہ شروع کر دوں گا۔ انھوں نے میرا خط پڑھا اور محترم سید احمد نقوی سے مکتبے کا وقت معلوم کیا۔ وہ اگلے دن سید احمد کے ہم راہ میری تمام مطلوبہ کتابوں کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے۔ میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے سینے سے لگایا اور فرمایا: 'تابش میاں! کتابوں کے سلسلے میں میری سختیاں سب کے لیے نہیں ہیں۔ آپ میرے عزیز ہیں، آپ پر مجھے اعتماد ہے، میں ہی کیا آپ پر تو نثار احمد فاروقی بھی اعتماد کرتے ہیں، جنھیں کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ آپ جب اور جس کتاب کی ضرورت سمجھیں، بہ سہولت لیں اور جب چاہیں واپس کریں۔' یہ ان کی خرد نوازی کا ایسا رویہ تھا، جو آج کے دور میں کم یاب ہے۔ درآں حالے کہ میں ایک ادنیٰ ریسرچ اسکالر تھا اور وہ پروفیسر تھے۔

صرف یادِ غمِ بے کراں رہ گئی
جانے والا گیا داستاں رہ گئی

○○


# اردو صحافت کا ارتقا

اردو صحافت نے ارتقاء کا عمل کن مراحل سے گزر کر پورا کیا ہے اور اس کے صحافیوں نے اپنی جفاکشی، محنت اور جدوجہد سے تاریخ کے صفحات پر جو نقوش ثبت کیے ہیں یہ کتاب دراصل اسی کا ایک مبسوط خاکہ ہے جس میں دو صدیوں پر محیط اردو صحافت کے تاریخی، فنّی اور تکنیکی ارتقاء کی تاریخ کو سمیٹا گیا ہے۔ کتاب میں اردو صحافت کو درپیش مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

مصنف: معصوم مرادآبادی صفحات: ۲۲۴، قیمت: ۱۵۰/روپے

ناشر: اردو اکادمی، دہلی